# جنگ آزادی کا مطمح نظر

اب ہمیں اپنی دوسری تنقیح کی طرف توجہ کرنی چاہیے، اور وہ یہ ہے کہ جس آزادی کیلیے یہ قوم پرست حضرات لڑ رہے ہیں اسکی نوعیت کیا ہے، اور کیا مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس نوعیت کی آزادی کسی درجہ میں بھی ہمارے لیے مطلوب یا مفید ہو سکتی ہے؟ اس تنقیح کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرینگے۔ ایک یہ کہ اس جنگ آزادی کا مطمح نظر کیا ہے؟ یعنی موجودہ حکومت کو ہٹا کر یہ کس قسم کی حکومت کن اصولوں پر قائم کرنا چاہتی ہے۔ دوسرے یہ کہ خود اس جنگ آزادی کی نوعیت کیا ہے؟ یعنی یہ انقلابی ذرائع سے کامل انقلاب چاہتی ہے یا نیم انقلابی نیم دستوری ذرائع سے بتدریج ایک نظام حکومت کو گرانا اور دوسرا نظام حکومت تعمیر کرنا چاہتی ہے؟ پہلے حصہ کو ہم مقدم رکھینگے اور دوسرے حصہ سے اخیر میں بحث کرینگے۔

جو لوگ اس وقت آزادی وطن کے علمبردار بنے ہوئے ہیں ان کے مطمح نظر کو سمجھنے کیلیے تمہید کے طور پر ایک مختصر تاریخی بیان ضروری ہے تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ ان کے تخیلات کا اصلی ماخذ اور ان کے جذبات حریت طلبی کا اصلی محرک کیا ہے۔

یہ ہر شخص جانتا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ وطنی تحریک براہ راست انگریزی تعلیم سے پیدا ہوئی ہے۔ مخالف اور موافق دونوں اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ انگریزی حکومت کی قائم کی ہوئی یونیورسٹیوں میں ہندوستانیوں نے تعلیم حاصل کی۔ وہاں یہ تاریخ، سیاسیات، اور معاشیات سے روشناس ہوئے۔ انگریزی زبان کے توسط سے مغربی افکار ان تک پہنچے، اور ان میں آہستہ آہستہ

وہ سیاسی شعور پیدا ہوا جو حکومت خود اختیاری کی خواہش کا مورث ہوا کرتا ہے۔ تقریباً ۵۰ سال تک ان جدید اثرات کے تحت پرورش پانے کے بعد جب ان کے اندر سیاسی اختیارات حاصل کرنے کا جذبہ ابھرنے لگا تو خود ان کے انگریز مربیوں ہی نے اس جذبہ کیلیے خروج کا راستہ پیدا کیا۔ پہلا شخص جسکے دماغ میں "انڈین نیشنل کانگریس" قائم کرنے کا خیال آیا وہ ایک انگریز، مسٹر ہیوم (Hume) تھا۔ ابتداءً اس کے پیش نظر محض ایک ایسی انجمن بنانے کا تصور تھا جس میں ہندوستان کے سیاسی دماغ مجتمع ہو کر تبادلۂ خیالات کیا کریں اور اس طرح حکمرانوں کو اپنے محکوموں کے داعیات سے واقف ہونے کا موقع ملتا رہے۔ اسی غرض کیلیے اسکی تجویز تھی کہ جس صوبہ میں اس انجمن کا اجتماع ہو وہیں کا گورنر اسکی صدارت کرے۔ مگر لارڈ ڈفرن نے، جو اس وقت ہندوستان کا وائسرائے تھا، اسکے خیالات کو بدل کر ایک دوسری راہ پر ڈال دیا۔ اس نے یہ رائے دی کہ:-

"ہندوستان میں ایسی ایک جماعت ہونی چاہیے جسکی حیثیت یہاں وہی ہو جو انگلستان میں حزب الاختلاف (Opposition) کی ہے تاکہ وہ حکومت پر نکتہ چینی کر کے اس کے نقائص کو دور کرتی رہے۔ نیز اس جماعت کو مستقل بالذات ہونا چاہیے۔ گورنر کی صدارت اسکی آزادی رائے میں خلل انداز ہوگی"

انگلستان میں لارڈ رپن، لارڈ ڈلہوزی، سر جیمز کیرڈ (Caird)، جان برائٹ، مسٹر ریڈ، مسٹر سلیگ (Slagg) اور دوسرے سیاسی مبصرین نے بھی لارڈ ڈفرن کی اس رائے کو پسند کیا، اور اسطرح ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی تاسیس ہوئی۔[1]

سیاسی عمل کی یہ ابتدا جس طرح انگریزی افکار اور انگریزی تدبر کی رہنمائی میں ہوئی اسی طرح مقاصد اور انکے حصول کی صورت کا تعین بھی آپ سے آپ انگریزی اثرات کے تحت، اور انگریزی دستور حکومت کے نمونے پر ہوتا رہا۔ کانگریس کو اول یوم پیدائش ہی میں "انڈین نیشنل کانگریس" کے نام

[1] ڈاکٹر پٹابھی سیتارامیا کی تاریخ کانگریس (انگریزی) (۱۹۴۷) صفحہ ۲۳-۲۴

سے موسوم کیا گیا، گویا کہ "انڈین نیشن" کے نام سے کوئی قوم موجود تھی اور یہ اسکی ایک اجتماعی ہیئت (کانگریس) بنائی جا رہی تھی۔ انگریزی تعلیم کے جو اثرات ان لوگوں کے دماغ پر پڑ رہے تھے، ان کا اثر اتنا گہرا تھا کہ انہوں نے ایک ملک کی آبادی کا ایک قوم ہونا، بطور ایک بدیہی کلیہ کے تسلیم کر لیا تھا، اور اسکے لیے وہ واقعات کی شہادت کو بھی غیر ضروری سمجھتے تھے۔ کانگریس کے پہلے اجلاس میں جو مقاصد اس جمعیت کیلیے تجویز ہوئے تھے ان میں سے دوسرا مقصد یہ تھا:

"قومی وحدت کے اُن واجبات کا نشوو ارتقاء اور استحکام جو ہمارے محبوب لارڈ رپن کے ہمیشہ یادگار رہنے والے عہد حکومت میں پیدا ہوئے ہیں"[1]

دوسرے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں ہم کو یہ الفاظ ملتے ہیں:

"ایک قومی کانگریس کو ان امور تک اپنے تئیں محدود رکھنا چاہیئے جن میں پوری قوم براہِ راست حصہ دار ہو۔ اور اصلاح معاشرت اور دوسرے طبقہ وار مسائل کو طبقات کی کانگریسوں کے لیے چھوڑ دینا چاہیئے"[2]

یہ وطنی قومیت اور واحد قومیت کا تخیل اس تحریک کے مایۂ خمیر کا پہلا عنصر ہے۔ جس طرح ۱۸۸۵ء میں بینرجی اور نوروجی "ہندوستانی قوم" کا ذکر کرتے تھے، اسی طرح آج گاندھی جی اور نہرو جی بھی کرتے ہیں۔ بلکہ وہ محض ذکر کرتے تھے اور یہ اسکو زبردستی مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ گاندھی جی استفہام انکاری کے لہجے میں پوچھتے ہیں کہ "ہندوستان ایک ملک اور ایک قوم ہے یا بہت سے ملک اور بہت سی قومیں؟" اور خود ہی اسکا جواب دیتے ہیں کہ جو لوگ اسکو ایک ملک اور ایک قوم سمجھتے ہیں انہیں اس پر اعتراض نہ ہونا چاہیے اگر مدراس کا وزیر اعظم ایک قوم کیلیے ایک زبان بنانے میں کرمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ کی جابرانہ طاقت استعمال کرے۔[3] نہرو جی استفہام کی بھی ضرورت

[1] ڈاکٹر پٹابھی سیتارامیا کی تاریخ کانگرس (انگریزی) صفحہ ۷۔

[2] *How India Wrought for Freedom*, by Annie Besant. p. 18

[3] "Congressman Beware," by Gandhi, in *The Harijan*. 10—9—38

نہیں سمجھتے اور قطعی طور پر اعلان کرتے ہیں کہ ہندوستان میں صرف ایک قوم بستی ہے جس کا نام ہندوستانی ہے۔ جداجدا مستقل قوموں کا یہاں وجود ہی نہیں ہے۔

دوسرا بنیادی تصور جو انگریزی تعلیم اور انگریز مربیوں کی سیاسی تربیت سے اخذ کیا گیا وہ جمہوریت (Democracy) کا تصور تھا۔ جمہوری ادارات کی مختلف صورتیں جو دنیا میں رائج ہیں اور رائج رہی ہیں، ان میں شاید سب سے زیادہ ناقص اور قدامت پرستانہ صورت وہ ہے جو انگلستان میں قائم ہے۔ لیکن ہمارا ہندوستانی وطن پرست چونکہ انگریز کا شاگرد ہے، اسی سے جمہوریت کا نام اس نے سنا ہے، اور اسی کے جمہوری نظام کا نقشہ اس نے دیکھا ہے، اس لیے یہ جب "جمہوریت" کا لفظ بولتا ہے تو اس کے سامنے جمہوری دستور کے وہی اصول اور وہی طریقے ہوتے ہیں جو انگلستان میں رائج ہیں۔ نمایندگی، انتخاب، ذمہ دار حکومت اور دستور سلطنت کی ساری کی ساری تفصیلات کو یہ جوں کا توں انگلستان سے ہندوستان اٹھا لانا چاہتا ہے۔ یہ اس حقیقت کو نہیں جانتا کہ قوموں اور ملکوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ جس قسم کے ادارات ایک ملک کے مناسب حال ہوں، لازم نہیں کہ وہ دوسرے ملک کے قامت پر راست آسکیں۔ قوت تمیز اور اجتہاد فکر کے بغیر محض دوسروں کی نقالی کرنا اصولاً بھی غلط ہے اور عملاً بھی مشکل بلکہ مضرت رساں۔ مگر مختلف اسباب ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو اس حقیقت کے بار بار سامنے لائے جانے پر بھی ہمارے وطن پرستوں کو اسکے ادراک سے روکتے ہیں۔ ایک گروہ غلامانہ ذہنیت اور محدود واقفیت کی بنا پر یہ سمجھتا ہے کہ "جمہوری ادارات" کا اطلاق صرف انگریزی طرز کے ادارات پر ہی ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے، لہذا اس طرز کی مخالفت کرنا نفس جمہوری ادارات کی مخالفت کرنا ہے۔ دوسرا گروہ انگریزی نمونہ کی جمہوریت کو غلط سمجھتا ہے مگر اس پر شکست خوردہ ذہنیت کا غلبہ ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہی جمہوری نظام جو ہمارے برطانوی آقا اپنے ملک سے لائے ہیں، اور جس کی پشت پر سٹین گن کی طاقت ہے، ہندوستان میں رائج

ہونا ہے اور ہو کر رہیگا، لہذا عافیت اسی میں ہے کہ اسکے آگے سپر رکھ دو۔ تیسرا گروہ جو کانگریس کا اصلی کارفرما اور کارکن گروہ ہے، غلامانہ ذہنیت کے ساتھ خود غرضانہ ذہنیت سے بھی ماؤف ہے۔ انگریزی طرز..... جمہوریت کو قبول کرنے میں سراسر اسی کا فائدہ ہے، کیونکہ یہ طرز جمہوریت، اکثریت کو مالک الملک لاشریک لہا بنا دیتا ہے، اور اتفاق سے یہی گروہ یہاں اکثریت میں ہے، لہذا یہ کہتا ہے کہ ہندوستان میں واحد قومیت کی بنیاد پر ایک "ڈیماکریٹک اسٹیٹ" قائم ہونا چاہیے۔ ۱۸۸۵ء سے ۱۹۳۸ء تک ۵۳ سال کی مدت میں کانگریس کے مطالبات کی صورتیں بہت کچھ بدلی ہیں۔ پہلے سرکار سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ ہمارے لیے ایک ایسا دستور حکومت بنا دو جس میں گورنمنٹ اہل ملک کے سامنے جواب دہ ہو۔ اب یہ مطالبہ ہے کہ ہم خود اپنا دستور بنائینگے۔ بظاہر پہلے موقف سے یہ دوسرا موقف بہت آگے بڑھا ہوا ہے، مگر اصولی حیثیت سے "ڈیماکریسی" کا جو تصور ۱۸۸۵ء میں تھا، بعینہ آج بھی وہی ہے، خواہ دستور حکومت سرکار بنائے یا یہ خود بنائیں۔

وطن پرستی کی اس تحریک میں انگریزی آقاؤں کا اثر محض علمی و نظری حیثیت ہی سے نہیں ہے بلکہ تقریباً ۵۰ سال سے جو سیاسی تربیت ہندوستانیوں کو ان کے یہ آقا دے رہے ہیں وہ عملاً بھی انہی اصولوں پر مبنی ہے۔ ۱۸۶۱ء سے ۱۹۳۵ء تک جتنے دستوری تغیرات اس ملک میں ہوئے ہیں، اور نظم و نسق حکومت میں ہندوستانیوں کو شریک کرنے کی جتنی صورتیں اختیار کی گئی ہیں ان سب میں انگریز کی اس فطری کمزوری کا اثر نمایاں نظر آتا ہے کہ وہ اپنے ملک کے جمہوری ادارات کو آئیڈیل سمجھتا ہے اور اس میں اتنی اجتہادی صلاحیت نہیں ہے کہ مختلف حالات کیلیے مختلف اصول وضع کر سکے۔ اگرچہ ابتدا سے اب تک ہر زمانہ میں انگریز مدبرین نے اس بات کو اصولاً تسلیم کیا ہے کہ ہندوستان انگلستان نہیں ہے، اور یہاں آنکھیں بند کر کے انگریزی طرز کے جمہوری ادارات قائم کرنا درست نہیں، مگر وہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ انکے ذہن میں ہر پھر کر جمہوریت

کے وہی تصورات اور وہی رنگ ڈھنگ آجاتے ہیں جنکے ماحول میں خود انہوں نے پرورش پائی ہے۔ وہ غیر شعوری طور پر اہل ہند کو ایک قوم فرض کر لیتے ہیں جس طرح اہل انگلستان ایک قوم ہیں۔ وہ جائز سمجھتے ہیں کہ یہاں ڈیموکریسی کے وہی اصول اختیار کیے جائیں جو واحد قومیت ہی کیلیے موزوں ہو سکتے ہیں۔ حالات کی رعایت زیادہ سے زیادہ ان کو جس چیز کے لیے آمادہ کر سکتی ہے وہ بس جداگانہ انتخاب ہے، یعنی یہ کہ ہندوستان کی مختلف قوموں کو ـــــ جنہیں وہ ایک قوم کے مختلف فرقے سمجھتے ہیں ـــــ اپنے ہی منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعہ سے اپنی خواہشات کے اظہار کا موقع مل جائے۔ مگر کوئی شخص کسی دلیل سے بھی یہ بات انکے دماغ میں نہیں بٹھا سکتا کہ جداگانہ انتخاب اسوقت بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے جب ان مختلف قوموں کے مجموعہ کو ایک قرار دیکر اکثریت کی حکومت کا جمہوری قاعدہ نافذ کر دیا جائے۔ انہوں نے میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں سے لیکر صوبوں اور مرکز کی قانون ساز مجالس تک جتنے جمہوری ادارے اس ملک میں قائم کیے ان سب میں کثرت رائے کے غلبہ کا اصول یکساں طور پر رائج کر دیا، اور اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوا کہ ہندوستان میں جو قوم کثیر التعداد واقع ہوئی ہے وہ زیادہ اور زیادہ سیاسی طاقت کی مالک ہوتی چلی گئی، بلکہ اس سے بھی بڑھکر اس کا بدترین نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ کثیر التعداد قوم اس سیاسی غلبہ کو اپنا فطری اور اخلاقی حق سمجھنے لگی اور قلیل التعداد قومیں اس فریب میں مبتلا ہو گئیں کہ جمہوریت کا مفہوم غلبۂ اکثریت کے سوا اور کچھ نہیں لہذا ان کو خود بھی اپنی مغلوبیت پر راضی ہو جانا چاہیے، کیونکہ انگلستان سے جو چیز آئے اسکے عین حق ہونے میں تو کلام ہی نہیں کیا جا سکتا۔

جس ملک میں ذہنی غلامی اس حد تک پہنچ چکی ہو کہ کسی چیز کے بجا و درست ہونے کے لیے محض صاحب بہادر کے قول و فعل کی سند کافی سمجھی جائے، حتی کہ اگر کسی ریلوے اسٹیشن پر صاحب چائے میں برف ڈال کر پیتے ہوئے دیکھے جائیں تو غلام ہندوستانی گھر پہنچ کر برف زدہ چائے پینے لگے

وہاں یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ صاحب نے جمہوریت کا جو مفہوم بتایا ہے اسکے درست ہونے میں شک کیا جائیگا۔ یہاں آزادی کے مدعی ایک سے ایک بڑھ کر موجود ہیں، مگر دماغوں کی غلامی ان سب کا مشترک سرمایہ ہے۔ جو لوگ یہاں آزاد خیالوں کے سرتاج سمجھے جاتے ہیں انکی غلام فطرتی بھی یہاں تک بڑھی ہوئی ہے کہ جب تک ایک وزیر ہند (لارڈ آیموری) نے جداگانہ انتخاب کو جمہوریت وقومیت کے منافی نہ قرار دیا تھا اس وقت تک یہ غریب اس حقیقت سے بالکل ناواقف تھے کہ واقعی یہ چیز اس درجہ منافی قومیت وجمہوریت ہے۔ اور جب یہ بات صاحب کی زبان سے سن لی گئی تو ڈاکٹر مونجے سے لیکر پنڈت جواہرلال تک ہر ایک اس زعم کیساتھ اس کا اعلان کرنے لگا کہ جس قول کو سرکار دولتمدار کی سند حاصل ہے اسکے برحق ہونے میں کس کو کلام کی جرأت ہوسکتی ہے! پھر جو صاحب یہاں آزاد خیالوں کے امام ہیں ان کا حال بھی یہ ہے کہ سرکار کے قائم کیے ہوئے جمہوری ادارات کو وہ جمہوریت کی ایک ہی فطری وبرحق صورت سمجھتے ہیں، اور ان ادارات کے اصول سے اختلاف کرنا انکے نزدیک سیاسی اصلاح وترقی کی مخالفت کرنا ہے، کیونکہ سیاسی اصلاح وترقی کی صراط مستقیم ایک ہی ہے جسکی طرف غلاموں کے ھادی برحق ــــ صاحب بہادر ــــ نے انکی رہنمائی کی ہے اور وہ بس یہ ہے کہ مختلف قوموں کو ایک مجموعہ قرار دیکر اس میں غلبۂ اکثریت کا جمہوری اصول نافذ کردیا جائے۔ صاحب کے دیے ہوئے اس علم پر غلام دماغوں کا یقین واذعان اور انشراح واطمینان اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ ریاضی کے اصول موضوعہ کی طرح اسے بیان کرتے ہیں اور اپنی ذہنی غلامی کے راز کو چھپانے کی بھی کوشش نہیں کرتے اسلیے کہ انہیں اپنی ذہنی غلامی کا احساس تک نہیں رہا ہے۔

قومیت اور جمہوریت کے ساتھ ایک تیسرا اساسی تخیل بھی ہے جو انھوں نے صاحب کی تعلیم وتربیت سے حاصل کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسٹیٹ کو دنیوی (Secular) یعنی غیر دینی ہونا چاہیے۔

غیر دینی کا ایک سادہ مفہوم یہ ہے کہ اسٹیٹ کا اپنا کوئی مذہب نہ ہو، وہ بجائے خود دنیوی ہو، اسکی اساس کسی مخصوص شریعت پر نہ ہو، وہ کسی خاص مذہب کی نصرت و حمایت نہ کرے، مگر اسکے ساتھ ہی وہ مخالفِ دین ( Anti-religious ) بھی نہ ہو بلکہ اپنے دائرے میں مذہبی نظامات کو تسلیم ( Recognise ) کرے، اور ان کو حکومت کے اختیارات میں سے کم از کم اتنے اختیارات تفویض کر دے جو اندرونی تنظیم کیلیے ضروری ہیں، مثلاً اپنے پیروؤں پر ٹیکس عائد کرنا، مذہبی قوانین کو ان پر نافذ کرنا اور انکی دینی تعلیم کا انتظام کرنا عام اس سے کہ وہ علحدہ مدارس کی شکل میں ہو یا مشترک تعلیمی نظام میں نازی دور سے پہلے تک جرمنی میں غیر دینی اسٹیٹ کا یہی مفہوم تھا اور اب بھی یوگوسلیویا، پولینڈ، لتھوانیا، فنلینڈ، اور ایستھونیا میں یہی مفہوم ہے۔ غیر دینی اسٹیٹ کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ دین کی نفی پر ( Negation ) قائم ہو، مخالفِ دین ہو، اس میں کسی دینی نظام کو تسلیم نہ کیا جائے، باشندوں کی اس حیثیت کو کہ وہ کسی خاص دین کے پیرو ہیں بالکل نظر انداز کر دیا جائے اور عمومی حاکمیت ( Popular Sovereignty ) کی تعبیر یہ کی جائے کہ باشندگانِ ملک ہونے کی حیثیت سے تو سب باشندے حاکمیت میں حصہ دار ہیں مگر ایک مذہب کے پیرو ہونے کی حیثیت سے اس حاکمیت میں ان کا کوئی حصہ نہیں، لہذا وہ خود اپنی حکومت سے بھی اپنے دینی نظام کی ترقی و استحکام کیلیے کوئی طاقت حاصل نہیں کر سکتے۔ لادینی کے اس مفہوم نے یورپ میں دو مختلف صورتیں اختیار کی ہیں۔ ایک ظالمانہ ( Aggressive ) جس میں حکومت کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ مذہبی لوگوں کو لامذہب بنایا جائے۔ اس کی مثال روس ہے۔ دوسری صورت معتدل ہے جس میں حکومت کی پالیسی یہ ہوتی ہے کہ مذہبی نظامات کو زندگی کی طاقت پیدا کرنے والے تمام وسائل سے محروم کر دیا جائے تاکہ وہ خود سوکھ سوکھ کر مر جائیں۔ اسکی مثال چیکوسلوواکیا ہے جہاں تعلیم کا نظام کلیتہً حکومت کے ہاتھ میں ہے اور اس سے دینی عنصر کو قطعاً خارج کر دیا گیا ہے اور حکومت

سرکاری طور پر کسی قوم کے دینی نظام کو تسلیم نہیں کرتی۔

ہندوستان میں ہمارے آقاؤں نے جو طریق کار اختیار کیا ہے وہ ایک عجیب قسم کی معجون مرکب ہے۔ بادشاہ سلامت حامی دین ( Defender of the Faith ) بھی ہیں، اسٹیٹ کی طرف سے ایک مذہبی محکمہ (Ecclesiastical Department) بھی قائم ہے، اسکے ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سلطنت کا کوئی مذہب نہیں ہے اور اس کا مذہب نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ مذہبی رواداری کے اصول پر قائم ہے (یعنی لادینی کا پہلا مفہوم)، مگر عملاً باشندگان ملک کے مذہب سے وہ برتاؤ کیا جاتا ہے جو چیکوسلوواکیا کی روش سے ملتا جلتا ہے۔ اس عجیب مکسچر کی تحلیل اگر سائنٹفک طریقہ سے کی جائے تو اسکے تین اجزاء برآمد ہونگے :-

۱- مذہبی رواداری کا اعلان و اظہار۔

۲- ایک خاص عقیدہ و مسلک کی طرف نظر عنایت۔

۳- دوسرے تمام عقائد و مسالک کیساتھ سنگدلانہ سرد مہری

ہندوستان میں "دینوی اسٹیٹ" کا یہ مرکب تصور فکر و عمل دونوں حیثیتوں میں ڈیڑھ سو برس سے پرورش پا رہا ہے اور ہمارے وطن پرستوں نے بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی تصور کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ ان کا ادعا ہے کہ ہماری تحریک غیر دینی ہے اور ہم ایسا دینوی اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں جسکی بنا کسی مذہب پر نہ ہوگی مگر اس میں مذہبی رواداری ہوگی۔ یہ آقایان نامدار کے بنائے ہوئے مکسچر کا پہلا جزء ہے۔ اور دوسرا جزء یہ ہے کہ ان کا لیڈر[1] ایک "مہاتما" ہے جو صداقت ( Truth ) اور اہما ( Non-violence ) کے خالص ہندوانہ تصورات کا علمبردار اور مبلغ بن کر اٹھا ہے، جسکے تصورات جنگ آزادی کی فکری بنیاد ہیں، جو صاف کہتا ہے کہ عدم تشدد

[1] پنڈت جواہر لال کے بقول "کانگریس سے عظیم تر" ( Bigger than Congress itself )

پالیسی نہیں بلکہ دین و ایمان ہے۔ اسکی رہنمائی میں تمام باشندگان ہند کیلیے سرکاری طور پر عمومی تعلیم کے خاکے بنائے جاتے ہیں اور ان سب میں اس کے دین و ایمان کو اساسی حیثیت دی جاتی ہے[1]۔ اب رہ گیا تیسرا جزء تو اسکی بھی پوری مقدار اس معجون میں شریک کی گئی ہے۔ صاف صاف کہا جا چکا ہے کہ باشندگان کی مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا اسٹیٹ کے فرائض سے خارج ہے، اور اس کے برعکس یہ چیز اسٹیٹ کے فرائض میں داخل ہے کہ باشندوں کو جبراً ایسی تعلیم دے جو انکے ذہن سے اپنے مذہب کی برتری کا خیال نکال دے۔ خود مہاتما گاندھی جنہوں نے اپنے مذہب کو باصرار وردھا اسکیم کا جزو لاینفک بنوایا ہے، اپنے مذہب کے سوا دوسرے تمام مذاہب کو نظام تعلیم سے خارج کر دینے کیلیے یہ دلیل ارشاد فرماتے ہیں :-

"تمام مذاہب کا یکساں لحاظ رکھنے کی تعلیم دینا ایک ایسی ضرورت ہے جسکے حق میں میرے خیالات بہت سخت ہیں۔ جب تک ہم اس خوشگوار حالت (یعنی سب مذاہب کو ایک نظر سے دیکھنے اور سب کو مساوی طور پر برحق سمجھنے کی حالت) کو نہ پہنچ جائینگے، اس وقت تک مختلف فرقوں میں حقیقی وحدت پیدا ہونے کی مجھے کوئی توقع نظر نہیں آتی۔ میرے نزدیک یہ بات مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے بچوں کے درمیان دوستانہ اسپرٹ کے نشو و نما کو غارت کرنے والی ہوگی اگر ان کو یہ سکھایا جائے کہ ان کا مذہب دوسرے مذاہب سے بہتر ہے یا یہ کہ وہی ایک سچا مذہب ہے۔ اگر قوم (؟ ہندوستانی قوم) پر یہی اختصامی جذبہ مستولی رہے تو اس سے لازم آئیگا کہ یا تو ہر مذہب والوں کے الگ الگ مدرسے ہوں جن میں ہر ایک کو دوسرے پر طعن کرنے کی آزادی حاصل رہے، یا پھر مذہب کا نام لینے ہی کو کلیتہً ممنوع قرار دے دیا جائے۔ اس قسم کا طرز عمل اختیار کرنے کے نتائج اتنے خوفناک ہیں کہ ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاق

[1] وردھا اسکیم، ودیا مندر اسکیم، اور اصلاح دیہات کی اسکیم (جسے ڈاکٹر سید محمود نے بہار میں جاری کیا ہے) تینوں میں اہمسا کی تعلیم کو اساس کی حیثیت دی گئی ہے۔

کے بنیادی اصول تمام مذاہب میں مشترک ہیں۔ وہ ضرور بچوں کو سکھائے جانے چاہئیں اور جہاں تک وردھا اسکیم کے ماتحت مدارس کا تعلق ہے ان میں بس اتنی ہی مذہبی تعلیم کو کافی سمجھنا چاہیے[1]"

اسی خیال کی ترجمانی ایک دوسرے ذمہ دار شخص مسٹر سمپورنانند (یوپی کے وزیر تعلیم) نے اپنی ایک تقریر میں کی ہے جو انہوں نے ۱۴ر اپریل ۳۸ء کو یوپی کی لیجسلیٹو اسمبلی میں ارشاد فرمائی تھی :-

"ہر وہ شخص جو ہندو یا مسلم تہذیب کے قائم رکھنے اور اس کو مدارس میں جاری کرنے پر زور دیتا ہے وہ یقینی طور پر ملک کو نقصان پہنچاتا ہے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ موجودہ ہندوستان میں یہ چیز مفقود ہونی چاہیے۔ ہم ایک ہندوستانی تہذیب چاہتے ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں اور دوسروں کیلیے جو اس ملک میں آئے ہیں اور جنہوں نے اس کو اپنا گھر بنا لیا ہے بالکل ایک ہے۔ اگر کوئی شخص واقعی ملک کی ترقی میں کوشاں ہے تو اسکو ایسی بات پر زور دینا چاہیے جس سے ہم میں تفرقے پیدا نہ ہوں جو سب کے لیے ضرر رساں ہیں۔ بلکہ ایسے امور ہوں جن سے ہندوستانی تہذیب کی تعمیر و ترکیب ہوتی ہو۔ تمام وہ باتیں جن سے ہم میں تفرقہ اور کشیدگی پیدا ہوتی ہے یقیناً ملک کے ساتھ دشمنی کرتی ہیں۔ اسلیے ملک کا عام مفاد مدنظر رکھتے ہوئے مجھے امید ہے کہ وہ لوگ جو لڑکوں اور لڑکیوں کے مدارس میں ہندو اور مسلم تہذیب قائم رکھنا چاہتے ہیں، اس بات پر زور نہ دینگے[2]"

اسی تقریر کا ایک فقرہ یہ بھی ہے :-

[1] "ہریجن" مورخہ ۱۶ر جولائی ۳۸ء
[2] "مدینہ" مورخہ ۲۱ر اپریل ۳۸ء

"جب ہندو مسلم تہذیبیں مٹ جائینگی تب ہی ہندوستانی تہذیب زندہ رہ سکیگی"[1]

ان تقریروں اور تحریروں سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ ہندوستانی وطن پرست جو اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں وہ ایک معنی میں دینی اسٹیٹ ہے اگر دین سے مراد مہاتما گاندھی کا دین لیا جائے۔ اور ایک معنی میں لادینی بلکہ مخالف دین (Anti-religious) اسٹیٹ ہے اگر دین سے مراد ہندوستان کے ان باشندوں کا دین لیا جائے جو دین گاندھی کے پیرو نہیں ہیں۔ اُن کے حق میں اس اسٹیٹ کا رویہ غیر جانبدارانہ رواداری نہ ہوگا بلکہ چیکوسلوواکیا کی طرح غیر ہمدردانہ اور ایک حد تک مخالفانہ ہوگا۔ اسکا مطمح نظر صریحاً یہ بتایا جارہا ہے کہ مختلف قوموں کی تہذیبیں کسی نہ کسی طرح فنا ہو جائیں، ان کا مذہبی زاویۂ نظر بدل جائے اور وہ تمام مذاہب کو برابر سمجھنے لگیں، یعنی کسی مذہب کے پیرو نہ رہیں، کیونکہ ایک مذہب کی پیروی کیلیے اس کو سب سے بہتر اور صحیح ترجاننا فطری طور پر ناگزیر ہے۔ اس کے بعد یہ خیال کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں رہتا کہ ایسا اسٹیٹ کسی مذہبی نظام کو قانوناً تسلیم کریگا اور اسکو تعلیم اور اندرونی تنظیم کیلیے وہ حقوق اور اختیارات دیگا جنکی مثالیں ہم نے اوپر یورپ کے متعدد ممالک سے پیش کی ہیں۔

ان تشریحات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے وطن پرست ہندوستان کیلیے جس قسم کی آزاد حکومت حاصل کرنا چاہتے ہیں اس کی بنیادی خصوصیات تین ہیں:

(۱) "نیشنل اسٹیٹ" اس معنی میں کہ ہندوستان کی پوری آبادی کو ایک قوم قرار دیا جائے اور جداگانہ قومیتوں کی نفی کردی جائے۔

(۲) "جمہوری اسٹیٹ" اس معنی میں کہ باشندگان ہند کو ایک مجموعہ قرار دیکر اس میں غلبۂ اکثریت کا اصول نافذ کیا جائے۔

(۳) "دنیوی اسٹیٹ" اس معنی میں کہ جہاں تک ہندوستان کی مختلف قوموں کے مذاہب کا تعلق

[1] ٹریبیون مورخہ ۵ / اپریل ۳۸ء

ہے ان کے لحاظ سے وہ ایک لادینی اسٹیٹ ہو[1]

اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ اس نوعیت کا اسٹیٹ دراصل کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم اس کو اپنا مطمح نظر بنا سکتے ہیں؟ کیا ایسے اسٹیٹ میں ہمارے مسلمان ہونے کی حیثیت برقرار بھی رہ سکتی ہے؟ کیا ہمارے لیے یہ جائز ہے کہ ہم اس کو قائم کرنے کی جدوجہد میں حصہ لیں یا صبر و سکون کیساتھ اسکے قیام کو گوارا کریں؟ آئندہ باب میں ہم ان سوالات پر بحث کرینگے۔

---

[1] ۲۹ اگست ۳۸ء کو مسٹر بھولا بھائی دیسائی (سنٹرل اسمبلی کی کانگریس پارٹی کے لیڈر) نے شملہ میں ایک تقریر فرمائی تھی جس میں اسٹیٹ کی انہی تین بنیادوں کو پوری تشریح کے ساتھ بیان کیا تھا۔ یہ تقریر یکم ستمبر ۳۸ء کے ٹریبیون میں شائع ہوئی ہے اور اس کا مطالعہ ہندوستانی وطن پرستوں کے طریق فکر اور نصب العین کو سمجھنے میں بہت کچھ مدد دیتا ہے۔